* ڈاکٹر بتول زہرہ

سماجی و معاشی ترقی میں پنجابی زبان کا کردار

Abstract:

This paper is about the debate over the role of language in socio-economic development. Drawing on the experience of Punjab, we examine the rich historical tradition of debate about the positive role which language can play in national development, and suggests a theoretical grounding for those arguments. The main thrust of this paper is that development, whether narrowly or broadly defined, cannot be achieved unless it involves the participation of all in the development process, and such participation inevitably requires that people are reached and are able to reach others in the language or languages in which they are competent.

Keywords: *Language, Punjabi, Role, Socio, Economic, development*

تعارف:

پسماندگی، غیر منصفانہ تقسیم، بچوں کو تعلیم کی عدم فراہمی اور عام آدمی کے لیے تفریحی سہولیات کی کمی کے نتیجے میں غربت، جہالت اور افلاس پیدا ہوتے ہیں۔ انہی بیماریوں کی وجہ سے پاکستان غیر ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم سے کیا غلطیاں سرزد ہوئیں؟

- پاکستان ترقی یافتہ ممالک میں کیوں شامل نہ ہوسکا؟
- کیا یہ ملک معاشی، سماجی اور انسانی ترقی میں بھارت، بنگلہ دیش اور سری لنکا جیسے ملکوں سے بھی پیچھے رہ گیا؟
- ہماری خوشحالی کی راہ میں کون سی بڑی رکاوٹیں ہیں؟
- ترقی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو کیسے دور کیا جا سکتا ہے اور ہم اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات آج نوجوان نسل کے ذہنوں میں آرہے ہیں۔ یہ مسائل جو ہم نے اپنے اکابرین سے ورثے میں پائے ہیں۔

اگرچہ حکمران اشرافیہ کی جانب سے آبادی کی اکثریت کا بہانہ تراش کر انسانی وسائل کی ترقی کو

جان بوجھ کر کم اہمیت کا حامل سمجھنا، پرائمری سے لے کر اعلیٰ سطح کی تعلیم کے لیے شہری علاقوں کو دیہی علاقوں کی نسبت زیادہ اہمیت دینا، وسائل کا غیر مؤثر استعمال، ناقص منصوبہ بندی، غیر ضروری مرکزیت اور کم عرصے والے مقاصد میں غیر ضروری الجھاؤ جیسے مسائل پاکستان کی معاشی و سماجی ترقی میں بڑی بڑی رکاوٹیں ہیں مگر اس مضمون میں صرف معاشی و سماجی ترقی میں مادری زبان کی اہمیت کے حوالے سے بات ہوگی جسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ترقی کے مفہوم طے کیے جائیں۔

ترقی کیا ہوتی ہے؟/ترقی کا مفہوم:

عمومی مفہوم میں ترقی سے مراد کسی بھی معاشرے میں اس کے رہنے والوں کے معیارِ زندگی میں ہونے والی بہتری ہوتی ہے، جس سے براہ راست ہر فرد کی آسائشِ زندگی میں اضافہ ہوتا ہے یعنی ایک انسان کا ذہنی اور جسمانی سکون، وہ بنیادی عناصر ہیں جو کسی بھی معاشرے کی انفرادی اکائیوں یعنی اس کے افراد کو مثبت انداز میں متحرک کر سکتے ہیں اور ترقی میں نا صرف اضافہ بلکہ اس کا تسلسل بھی قائم رکھنے میں اہم ترین کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ایک اور زاویے سے دیکھیں تو ترقی وہ عمل ہے جس میں انسان اپنی صلاحیتوں اور ارادوں کو اپنی اور دوسروں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے فروغ دیتا ہے۔ سماجی نظریات کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ خواہشات کو مخصوص سمت میں لے جانے اور مختلف جہتوں کو اکٹھا کرنے کا نام ترقی ہے۔ باالفاظ دیگر، ہم ترقی کو یوں بیان کر سکتے ہیں:

> "سماجی نظام کی ترقی وہ تخلیقی عمل ہے جس میں سماجی نظام اپنی صلاحیتوں اور خواہشات کو اپنے ارکان کی خدمت اور اُن کے تحفظِ ماحول کے لیے وقف کر دیتا ہے۔۔۔ جس میں انسان اپنی ہر ضرورت اور خواہش کو مطمئن کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے۔"[(1)]

درج بالا تعریف کی روشنی میں ہم ترقی کو تین حصوں میں بانٹ سکتے ہیں:

1۔ معاشرے میں پیداواری نظام کی کارکردگی میں اضافہ
2۔ عوام کو بنیادی ضروریات کی تسلی بخش فراہمی
3۔ معاشرے میں مختلف گروپوں کی اپنے مقاصد کے حصول میں کامیابی

لفظ ترقی متعلقہ ملک کی سماجی و اقتصادی بہبود سے منسلک صفات جیسے کم ترقی یافتہ، ترقی پذیر اور ترقی یافتہ کی بنیاد بھی ہے۔ اگرچہ اس بات میں ابھی تک اتفاق نہیں ہو پایا کہ کون سا ملک کم ترقی یافتہ یا زیادہ ترقی یافتہ ہے سوائے اس کے کہ ایک عمومی اتفاق موجود ہے کہ اگر کسی معاشرے میں مجموعی قومی پیداوار، فی کس آمدنی، ذرائع روزگار، زندہ رہنے کی امید، صحت کی مجموعی صورت حال، خواندگی کی شرح، تعلیم کا معیار، ذرائع آمدورفت اور ذرائع مواصلات کا معیار (جیسے ٹیلی فون، اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی

وڑن) اورعوام کا غربت کی لکیر سے اوپر زندہ رہنے کا معیار کیا ہے۔[2]

مذکورہ بالا اوامر سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عوام میں کم شرح خواندگی اور آپسی رابطے کا فقدان ،ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے ، ان مشکلات کو دور کیے بغیر ترقی کا خواب ادھورا رہ جاتا ہے۔آیئے ہم اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ معاشرے میں آپسی رابطے کا فقدان کیسے ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث ہے۔

معاشی وسماجی فرق: ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ:

یہ کسی فرد کا اپنی زبان کو استعمال کرتے ہوئے نفسیاتی تفاخر جیسا رویہ اپنانے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک عام فہم حقیقت ہے کہ زبان اور خیالات ایک دوسرے کے ساتھ گہرے طور پر جڑے ہوتے ہیں۔ یوں خیالات تیزی سے فروغ پاتے ہیں جب کوئی فرد اپنی زبان کو ذریعۂ اظہار بناتا ہے۔ سوچ اور زبان کی ترقی قوموں کی ترقی اور اس میں بسنے والے افراد کے باہمی اتحاد کی خواہش کا انڈیکس ہوتی ہے۔ایک فرد کی دوسرے سے ذرائع مواصلات کی کمی کمیونٹی میں نا اتفاقی کا باعث بنتی ہے جس کے نتیجے میں افراد میں فرسٹریشن اور ناامیدی بڑھتی ہے اگرچہ ایک انسان ہونے کے ناطے ان میں مل کر کام کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔[3] اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں مختلف زبانیں بولنے والے افراد ایک عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں مگر ان کا یہ کام ادھورا رہ جاتا ہے صرف اس بنیاد پر کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہوتے ہیں۔اس مثال کو ہم ملک پاکستان پر بھی منطبق کر سکتے ہیں۔ یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''ترقی کو مؤثر طور پر وقوع پذیر کرنے کے لیے ہمیں اپنے طرزِ عمل اور زبان کے فرق کو مقامی سرکاری یا غیر سرکاری ایجنسیوں کے ذریعے دور کرنا چاہیے اور ان تمام افراد کی تربیت اس انداز میں کی جانی چاہیے کہ وہ مقامی دیہاتی افراد کی زبان سے واقفیت حاصل کر سکیں خاص طور پر ان دیہاتی لوگوں کی تحریروں سے واقفیت حاصل کریں جہاں ترقی کا عمل کیا جانا ہے۔''[4]

درج بالا نقطہ نظر کا تقاضا ہے کہ معاشی وسماجی ترقی کے لیے لسانی اختلافات پس پشت ڈال دیے جائیں۔ان دعووں کو البتہ مزید جانچنے کی ضرورت ہے۔اس کے لیے ہمیں اس دعوے کو بھی جانچنے کی ضرورت ہے کہ کیا کثیر لسانی معاشروں میں یک لسانی کا حصول ممکن ہے۔

کیا یک لسانی ضروری ہے؟

معاشرے کی ترقی کے لیے، کچھ سکالرز کا ماننا ہے کہ یک لسانی ضروری ہے کیونکہ علاقائی زبانوں کا زیادہ استعمال آبادی کے مختلف گروہوں میں رابطے کا فقدان پیدا کر دیتا ہے جس سے حکومتی معاملات چلانا دشوار ہو جاتا ہے۔[5] سکالرز مزید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ

جانکاری دینے والے افرادترقی یافتہ افراد کی اصطلاحات کی سمجھ بوجھ نہیں رکھتے۔[(6)] ان سکالرز کا یہ کہنا بھی ہے کہ عام انسان حکومتی پراپیگنڈہ سے لاعلم رہتے ہیں کیونکہ جو زبان استعمال کی جارہی ہوتی ہے وہ عام افراد کی سمجھ سے بالا ہوتی ہے۔اسی طرح عام افراد جن میں دیہاتیوں اوران پڑھ افراد کی ایک کثیر تعداد شامل ہوتی ہے وہ تاجروں اور عدالتی معاملات سے نابلد ہوتے ہیں کیونکہ ان پیشوں سے وابستہ افراد کثیرلسان یعنی ایک سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں۔ان کے خیال کے مطابق معاشرے کی ترقی کے لیے یک لسانی نہایت ضروری ہے یعنی ہم سب کو ایک زبان بولنی چاہیے۔

اب اس مسئلے کا دوسرا رُخ دیکھتے ہیں۔ایسے لوگ جو کثیرلسانی کی وکالت کرتے ہیں ان کا ماننا ہے کہ مقامی زبانوں کو فروغ دیئے بغیر نئے نظریات جنم نہیں لے سکتے لہٰذا ترقی کا حصول ممکن نہیں۔ان کا خیال ہے کہ اصطلاحات کے مغالطے کو مقامی زبانوں کی ترقی کے بغیر حل نہیں کیا جاسکتا۔لہٰذا کثیرلسانی سماج میں یک لسانی کی خواہش ایک ناممکن العمل خواہش ہے۔[(7)]

کیا کثیرلسانی ناممکن ہے؟

کسی بھی زبان کی سمجھ بوجھ بہتر طور پر تبھی ممکن ہے جب اس زبان کی کمیونٹی یعنی اس کے بولنے والوں کے ثقافتی نمونے کو بہتر انداز سے سمجھ لیا جائے۔عام مشاہدہ ہے کہ ہمیں شرمندگی، الجھن اور غلط فہمی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اگر ہم کسی دوسرے کی زبان کا مناسب علم اوراس زبان کے بولنے والوں کا سماجی ثقافتی پس منظر نہیں جان لیتے۔

ایسا کہنے کی حد تک آسان لگتا ہے کہ زبان تمام ملکی مسائل حل کر لے گی اور یہ ہماری آئندہ نسلوں کے بوجھ اُتار پھینکے گی۔میرے خیال میں ایسا سوچنا "کبوتر کی طرح" آنکھیں بند کر لینے کے مترادف ہے۔یہ اس صورت حال میں مشکل بن جاتا ہے جب بچہ ایک اور زبان بولے جبکہ اس کے ماں باپ کسی دوسری زبان میں اس سے گفتگو کرنا چاہ رہے ہوں یا بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بچے کو کسی دوسری زبان کی اخلاقیات سکھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں جبکہ ہم ان اخلاقیات پر خود عمل نہیں کر رہے ہوتے۔بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بچوں کو وہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں جن کا سمجھنا وہ نہایت مشکل سمجھتے ہیں۔[(8)]

یہاں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کثیرلسانی معاشروں (جیسے پاکستان) میں بچے اپنے گھروں یا نزدیکی کھیل کود کے میدانوں میں مکمل ثقافتی علوم حاصل نہیں کر پاتے۔دراصل، وہ لوگ جو گھر میں یا آس پڑوس میں (نوزائیدہ بچے اور ریٹائرڈ بوڑھے) رہنے پر مجبور ہیں وہ حقیقی طور پر یک لسان نہیں رہ پاتے۔[(9)]

پاکستان ایک کثیرلسانی ملک ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے ان علاقوں میں جہاں کثیرلسانی گروہ پائے جاتے ہیں وہاں بہترین تعلیمی نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔قومی زبان کے ذریعے بہترین تعلیم اور علم حاصل کیا جاسکتا ہے اگر طالب علم کو کم از کم پانچویں جماعت تک اس کی مادری زبان میں تعلیم دی

جائے جبکہ قومی زبان کو بطور ایک مضمون کے تیسری جماعت سے شروع کیا جائے جو چھٹی جماعت سے مادری زبان ذریعہ تعلیم کی جگہ لے لے۔[10] قیام پاکستان کے ابتدائی دنوں میں سرکاری ماہرین نے اس طرح کی پالیسی بنانے کے لیے تجاویز دی تھیں۔[11] تاہم مقتدر حلقوں نے اردو کی ترویج اور بالواسطہ فروغ کے لیے ان تجاویز کو ایک واحد ''قومی پالیسی'' کی نذر کر دیا جس کے نتیجے میں کثیر لسانی اب ایک پنڈورا باکس کی شکل اختیار کر چکی ہے۔

اس صورت حال کے در پردہ کون سے عوامل اور مشکلات پائی جاتی ہیں اور کیوں یہ صورتحال خصوصی غور و خوض کی متقاضی ہے، آیئے ان عناصر کا تجزیہ کرتے ہیں جنہوں نے پاکستان میں علاقائی زبانوں (جنہیں پاکستانی زبانیں کہنا مناسب اور مبنی بر انصاف ہے) کی ترقی و ترویج کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ یہاں ہم بطور خاص پنجابی زبان کا جائزہ پیش کریں گے۔

پنجابی زبان کے بارے میں حقائق:

پنجابی طالب علموں کی اکثریت (تقریباً 59 فی صد) اپنی زبان کے متعلق منفی رویے کا اظہار کرتی ہے۔ وہ عام طور پر بطور ذریعہ تعلیم اس کی حمایت نہیں کرتے اور نہ ہی عام زندگی میں اس کی پریکٹس کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ ویسے بھی وہ اس زبان کو اقتصادی طور پر غیر اہم سمجھتے ہیں۔[12] اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ''اساتذہ کی اکثریت (یونیورسٹیوں اور کالجوں میں) لیکچر دیتے ہوئے اردو یا پنجابی میں بات چیت کرنے پر مجبور ہیں۔''[13] یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجابیوں کی اکثریت روزمرہ زندگی میں خود اعتماد اور خود انحصار ہے۔ شاید زندگی میں ان کا یہ اعتماد ہی ہے جو انہیں اپنی زبان کے متعلق غافل کیے ہوئے ہے۔[14] ہمارا مشاہدہ ہے کہ پنجابی مقتدر حلقوں کے خلاف بطور مزاحم قوت کے کبھی بھی مستعد نہیں رہی، یہ اس بات کا اظہار ہے کہ اردو آج بھی پنجابی ثقافت کے لیے ایک اجنبی کے طور پر شمار کی جاتی ہے یعنی عام پنجابی اردو بولنے والے مقتدر حلقوں کو اپنا دشمن خیال نہیں کرتے۔ پنجابی زبان یقینی طور پر بیک وقت دوست اور اجنبی کے درمیان پھنسی ہوئی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ پنجابی زبان کو شناخت کا ایک پہلے سے تسلیم شدہ حصہ سمجھ لیا گیا ہے اگرچہ اسے بطور ایک پریشر گروپ کے زیادہ وسائل اور طاقت کے حصول یا ہتھیار کے طور پر نہیں استعمال کیا جاتا۔[15]

پنجابیوں کے پاس پہلے سے طاقت موجود ہے صرف ان میں نسلی طور پر خطرہ پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے پنجابی زبان کی تحریک کو مالی وسائل اور فوائد کے حصول کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ جذباتی وابستگی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی زبان کی تحریک مستقبل قریب میں کامیاب ہوتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی کہ پنجابیوں کی اکثریت طبقہ اشرافیہ سے وسائل کی شکل میں فوائد سمیٹ لیتی ہے۔[16] آیئے اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ ایسی صورت حال کیونکر پیدا ہوئی۔

پنجابی زبان کی تحریک کی تاریخ:

مختصراً ہم اگر پنجابی زبان کی تحریک کو برطانوی دورِ حکومت سے آزادی کے بعد تک سمیٹنے کی کوشش کریں تو اس کا خلاصہ کچھ یوں بنتا ہے:

> ''پنجابی زبان کی تحریک کے کارکن پنجابی کو تعلیمی، انتظامی اور عدالتی معاملات میں استعمال کرنے کی بات کرتے ہیں۔ اس میں وہ کامیاب کیوں نہیں ہوئے؟ اس لیے کہ پنجابیوں کی اکثریت فوج اور بیوروکریسی میں موجود ہے لہٰذا یہ تحریک ابھی تک نامکمل ہے۔ دراصل بہت سارے افراد (اعلیٰ اور درمیانے طبقے کے پنجابی) اردو کی حمایت کرتے ہیں اور اپنی شناخت بطور پنجابی کروانے کی بجائے بطور پاکستانی کرواتے ہیں۔ یہاں اس بات کی وضاحت کرنا مشکل ہے کہ پنجابی زبان کے کارکن ایسا کیوں نہیں کرتے۔ کیا پنجابی تحریک کے کارکنوں نے طاقت حاصل کر لی ہے؟ چونکہ عام طور پر لوگ آسانی سے اردو بول اور لکھ سکتے ہیں (اور بعض انگریزی بھی) لہٰذا ان کے لیے پنجابی طبقہءِ اشرافیہ سے میل ملاقات اور ان کے ساتھ فوائد کے حصول میں شراکت داری آسان دکھائی دیتی ہے لہٰذا وہ ان کی مخالفت نہیں کرتے۔''(17)

مزید برآں، ان میں سے کچھ کے پاس سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے اور کچھ کے لیے مرکزی دھارے کی سیاست میں شمولیت اور خود کو بطور پاکستانی منوانا زیادہ مشکل نہیں۔ یہاں ایک اور الجھن درپیش ہے۔ یعنی پھر کیا وجہ ہے کہ کچھ لوگ اردو کی بجائے پنجابی ادبی تنظیموں کے ممبر بننا پسند کرتے ہیں۔ اس کی صرف ایک وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ پنجابیوں کا وہ ردِعمل ہے جو انہیں زبردستی پاکستانی بننے پر مجبور کرتا ہے کیونکہ عام طور پر پنجابی زبان کی تحریک کی حمایت کو پاکستان کی شناخت کی مخالفت سمجھا جاتا ہے اور پنجابی زبان و ادب کے حمایتیوں کو ریاست مخالف تصور کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں، قیامِ پاکستان کے فوری بعد پنجابی کو بطور یونیورسٹی مضمون کے ختم کر دیا گیا کیوں اس کا تعلق سکھوں سے جوڑ دیا گیا۔ یوں ریاست کی سطح پر اردو کے فروغ نے پنجابی کو حکومتی دائرے سے خارج کر دیا۔(18)

عام طور پر مسلمانوں نے خود کو پنجابی کی بجائے اردو سے وابستہ کرلیا۔ ایسا کرنے سے مسلمانوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے خلاف ایک پریشر گروپ بنانے میں مدد ملی۔ یوں اردو مسلمانوں کی پہچان قرار پائی۔ دریں اثنا پنجاب کے نیم خواندہ اور نا خواندہ افراد جو جدیدیت سے شعوری طور پر ناخواندہ تھے، وہ پنجابی کے لوک ادب سے خود کو محظوظ کرتے رہے۔ مسجد سکولوں میں پنجابی لوک داستانیں پڑھائی جاتی رہیں اور بازاروں میں اخلاقی قصے کہانیاں بکتی رہیں۔(19)

یہ بات ایک عام انسان آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ پاکستان میں زبانوں کی تحاریک میں پنجابی سب سے زیادہ منفرد اور انوکھی ہے یعنی پنجابی زبان کی تحریک عقلی بنیادوں پر نہیں چلائی جارہی، اس کا کوئی

واضح مقصد نہیں اور نہ ہی یہ کسی مالی فوائد کے لیے چلائی جا رہی ہے (میں ان تنظیموں کے رہنماؤں کی بات نہیں کر رہا)۔ پھر بھی ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک جدید عمل ہے۔ اگر اردو اور انگریزی کے طاقت کے مراکز میں پنجابی دانشور اپنی جڑوں سے بیگانہ ہوجاتے تو پنجابی زبان کی تحریک کبھی بھی شروع نہ ہوتی۔ یہ الگ بات ہے کہ جدید دور میں پنجابیوں کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے سکولوں کالجوں اور میڈیا میں خواہ مخواہ انگریزی پڑھانے پر زور دیا جانے لگا ہے۔[20]

پنجابی زبان کی معاشرے میں موجودہ صورت حال کا ہم ڈاکٹر طارق رحمان کے ان الفاظ کے ذریعے جائزہ لے سکتے ہیں:

> ''ایک زبان کے غلبے کے باعث مفتوحہ زبانیں ختم ہونے کے قریب پہنچ چکی ہیں...... عملی سطح پر مفتوحہ زبانوں کی ثقافت اور ادب کو کم تر خیال کیا جاتا ہے یعنی انہیں کم طاقتور اور گھٹیا سطح کے کاروبار سے وابستہ کر دیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے عوام اپنے بچوں کو یہ زبانیں پڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔''[21]

بچوں کا غیر محفوظ مستقبل دیکھ کر ہی بہت سے پنجابی اپنے بچوں کو مادری زبان پنجابی کی بجائے انگریزی کی تعلیم دلواتے ہیں۔ یہ قابل فہم ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ طاقت کے مراکز نے اپنا رویہ تبدیل نہیں کرنا تو پھر وہ اپنے بچوں کو طاقت کے حصول سے دور کیوں کریں۔

بحران کا حل:

کیا زبان کے اس بحران کا کوئی علاج ممکن ہے؟ کیا پنجابی زبان کو مکمل طور پر مٹنے سے بچایا جاسکتا ہے؟ یا کم از کم زبان کے زندہ رہنے کا کوئی بندوبست کیا جاسکتا ہے؟ عبرانی (Hebrew)، رومانی (Romani) اور کارنش (Cornish) زبانوں کی مثالیں سامنے رکھیے تو یہ سوچ محض خیال نہیں رہتی۔ عبرانی پچھلے 1700 سالوں سے ''مردہ'' زبان شمار کی جاتی تھی جب کہ اس کے بولنے والے لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ کیا ایسی کوششوں کا مثبت نتیجہ نکل سکتا ہے؟ اگر ہمیں پنجابی زبان کے بچ رہنے کی ذرا سی بھی امید نہیں تو ہمیں اس کے لیے کوشش کیوں کرنی چاہیے یا اس کے لیے وقت ضائع کرنے کی بجائے کسی دوسری سماجی سرگرمی میں وقت لگانا چاہیے۔ مگر دوسری جانب اگر اس کے بچنے کی ذرا سی امید ہے تو پھر بجٹ اور پیسے نہ ہونے کا بہانہ کرنا عقل مندی نہیں۔

اگرچہ پنجابی زبان کے فروغ کے لیے کئی ادارے کام کر رہے ہیں جن میں پنجاب یونیورسٹی لاہور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، قائد اعظم یونیورسٹی کا شعبہ ''نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز''، پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج اینڈ کلچر لاہور، پنجابی ادبی بورڈ لاہور، لہراں ادبی بورڈ لاہور، سانجھ لاہور، پنجابی ادبی مرکز لاہور، پنجابی ادبی پروار اسلام آباد، پنجابی ادب سنگت اسلام آباد، پنجابی ادبی سنگت سچ سنگ گجرات، روزن ادبی فورم گجرات خاص طور قابلِ ذکر

ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سارے ادارے ماہانہ، دو ماہی، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ پرچے اور رسالے شائع کر رہے ہیں۔ ان اداروں کا مقصد پنجاب، پنجابی اور پنجابیت کی شناخت اور زبان کے فروغ میں اپنا حصہ ڈالنا ہے مگر بدقسمتی یہ ہے کہ پنجابی کے ماہر اور کارکن (چند ایک کو چھوڑ کر) موجودہ عصری تقاضوں اور زبان کی لسانیاتی حوالوں سے تبدیلی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اور ''زبان کے بچاؤ'' کا کیسے اہتمام کیا جائے اس سے بالکل ہی لاپرواہ ہیں۔ ان اداروں میں سیاسی بنیادوں پر بھرتیوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی ہے۔ پنجابی زبان کی بحالی کے منصوبے کی کامیابی کے لیے صرف نیک خواہشات ہی کافی نہیں بلکہ اس کے لیے عملی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ فی زمانہ پنجابی زبان کی ترقی کے لیے مصروف دانشور انیسویں صدی کی فلالوجی کی روایت کے امین اور ایسا رہنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ جدید دور کی لسانیاتی ترقی سے نہ صرف نابلد ہیں بلکہ اس کے حصول میں بھی سنجیدہ نہیں۔ پنجابی زبان کے کارکن، جو پنجابی زبان کی قیادت کرتے ہیں انہوں نے عوام کو جذباتی نعرے بازی تک ہی محدود رکھا ہوا ہے جبکہ زبان کی ترقی کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں گرامر جدید لسانی بنیادوں پر لکھی جائے، قواعد اور ضوابط اور گرامر کا تقابلی جائزہ وقتاً فوقتاً لیا جاتا رہے، لغت کو دوسری زبانوں کی لغات سے تقابل کیا جاتا رہے، پرائمری کی سطح تک اس زبان کا نفاذ کیا جائے۔ دوسری جانب اساتذہ کی تربیت کے لیے انہیں شارٹ ٹرم کورسز کروائے جائیں۔ اساتذہ کو کورسز اس لیے کروائے جائیں کہ مقامی لوگ اپنی زبان کے بہترین استاد ہوتے ہیں مگر وہ طریقۂ تعلیم و تعلم سے واقفی نہیں رکھتے۔ اگر غیر مقامی لوگوں سے تعلیم دلوائی جائے گی تو وہ اس علاقے کی سماجی روایات و روزمرہ ومحاورہ سے ناواقف ہونے کی بنا پر طالب علموں کو ثقافتی طور پر ناخواندہ ہی رکھیں گے۔ یوں بات پھر پنجابی کے سینئر اساتذہ اور دانشوروں پر آن پڑتی ہے مگر یہاں ایک مشکل درپیش ہے۔ اِن دانشوروں نے بھی اردو اور فارسی کے زیر سایہ پناہ لے رکھی ہے کیونکہ یہاں سے انہیں مال بنانے میں آسانی رہتی ہے۔ غیر ملکی ایجنسیوں کے ذریعے لیکچر دینا، ٹی اے/ ڈی اے اور ہوائی جہاز کے ٹکٹ منگوانے کی فکر میں رہنا زبان کی خدمت نہیں کہلاتی۔ کچھ بدقسمت ایسے بھی ہیں جو زبان کے فروغ میں سنجیدہ تو ہیں مگر انہوں نے ہمسایہ ملکوں کی ایجنٹی کا ٹھپہ لگوا کر معاملہ ہی چوپٹ کروا لیا ہے۔ کچھ خودنمائی کے شوقین بے چارے آج بھی جانتے بوجھتے تحریک پاکستان کی ضرورتوں (بحوالہ اردو زبان) کے سحر سے باہر نہیں نکل پائے۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ گورنمنٹ یا اداروں کی سطح پر عوام کو ترغیب دی جانی چاہیے کیونکہ اداروں اور حکومتوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں ہوتی۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کسی بھی زبان کے اختیار کرنے میں مقامی لوگوں کی شمولیت ضروری ہوتی ہے کیونکہ ان کی عدم شمولیت سے کوئی بھی تحریک یا پراجیکٹ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ یعنی پنجابی زبان بطور ذریعہ تعلیم کا نفاذ انہوں نے خود ہی کرنا ہے۔ دوسری زبانوں کے ماہر یا بیرونی ماہرین صرف ڈکشنریاں یا کتابیں لکھ کر لائبریریوں کی زینت ہی بنوا

سکتے ہیں۔ میرا اشارہ ان کے سیاسی مقاصد کی طرف ہرگز نہیں۔

اگر ہمیں پنجابی زبان کی بحالی کرنی ہے تو یہ کام مقامی لوگ خود کرنے میں پہل کریں۔ زبان کی بحالی اور نفاذ کو صحت، بنیادی تعلیم اور اقتصادی بحالی جیسے پراجیکٹوں کی طرح چلانے کی ضرورت ہے۔تاہم یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ کیا پنجابی زبان کی بحالی کی کوئی بھی کوشش حقیقت پسندی پر مبنی ہوگی؟ نظری سطح پر یہ مقاصد حاصل کیے جاسکتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح عبرانی، رومانی اور کارنش زبانوں کے بولنے والوں نے حاصل کیے ہیں۔تاہم عملی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زبان کی تبدیلی کی رفتار سست رہے گی (انگریزی سے پنجابی کی جانب)۔ یہ صورت حال صرف جنگی بنیادوں پر کام کر کے ہی دور کی جاسکتی ہے۔ یہاں ہم زبان کے معاملے میں سیاسی شمولیت کو خارج از امکان نہیں سمجھتے۔

نکتۂ فکر:

یہاں یہ سوال جنم لیتا ہے کہ ہمیں پنجابی زبان کی بحالی کی فکر کیوں ہونی چاہیے۔اس صورت میں جبکہ اس کے لیے ڈھیر سارا وقت، ان تھک کوشش اور بے شمار وسائل کی ضرورت ہو۔ہمیں یہ سوال بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ بہت سارے پنجابیوں کے بقول زبان میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے اور وہ زبان کی اہمیت کی بالکل بھی جانکاری نہیں رکھتے۔ ان کے بقول زبان کی بحالی میں ان پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ وہ زبان کی ترقی کے لیے پیسہ لگانے کو وہ کسی لسانی گروپ کی ترقی قرار دیتے ہیں (پنجابی یونین اور ورلڈ پنجابی کانگرس بطور مثال پیش کی جاسکتی ہے)۔ جب تک سوچ کی یہ تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس سوال کا جواب سنجیدگی سے نہیں دیا جاسکتا کہ ''ہمیں پنجابی زبان کیوں محفوظ کرنی چاہیے؟'' تب تک اس زبان کے محفوظ اور زندہ رہنے کے مواقع کم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ سوال کہ ''ہمیں خیال کیوں کرنا چاہیے'' کے کئی جواب دیئے جاسکتے ہیں جن میں سے کچھ یوں ہیں:

1. لسانیات، زباندانی کے ماہرین اور اس زبان کی تحریک سے وابستہ افراد اس بات پر متفق ہیں کہ کسی بھی زبان کی موت سے معاشرے کو ناقابلِ تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ جو اس بات کو نہیں سمجھتے وہ اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ سائنسی نقطہ نظر کے باعث جیسے دنیا کی تباہی قابل افسوس ہے اسی طرح زبان کا نقصان دراصل دماغ کی کھلی اس کھڑکی کو بند کرنا ہے جس کے ذریعے ہم دنیا کے بارے میں غور و خوض کرتے ہیں۔
2. کئی لوگ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ لسانی تبدیلی دراصل علم اور دانش کا نقصان ہے۔ ہر زبان میں دنیا کو پرکھنے اور کھوجنے کا اپنا پیمانہ ہوتا ہے۔ اس زبان کے ادب میں معاشرے کی دانش، روایات، اقدار ہوتی ہیں تاہم اس پیمانے کا ضیاع دراصل کئی نسلوں کے ورثے کا نقصان ہے کیونکہ زبان میں تنوع کا رکنا دراصل نظریات میں جمود کا باعث بنتا ہے۔
3. لسانی تنوع انسانوں کے لیے خزانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا میں اب تک سینکڑوں زبانیں

مٹ چکی ہیں جس کے باعث ان زبانوں کا ادب بھی مٹ گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر زبان وہاں کی عوام کے لیے ذاتی، سماجی اور روحانی پہچان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

مختصراً قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پنجابی سماج اپنے بہترین مفاد کے لیے پنجابی کو مٹنے سے بچانے کے لیے آگے آئے کیونکہ زبان کی تباہی دراصل ان کی شناخت کو مٹانے کا باعث بنا ہوا ہے۔ شناخت کے علاوہ ثقافت کا نقصان بھی ہورہا ہے۔ زبان کے نقصان کے باعث معاشرے میں خوداعتمادی کی کمی کا باعث بھی ہے اور انسانی وسائل کو کم بھی کر دیتا ہے جس کے باعث غربت، خاندانوں میں ٹوٹ پھوٹ، بچوں کی ادھوری تعلیم جیسے مسائل جنم لے چکے ہیں۔ سرکاری سطح پر پنجابی زبان کی شناخت دراصل معاشرے میں عوام کی عزتِ نفس بڑھانے کا باعث بنے گی کیونکہ زبان کا مرنا کبھی بھی خوشحال معاشروں میں ممکن نہیں ہوتا بلکہ محکوم، کمزر اور اقتصادی طور پر بدحال معاشروں کا مقدر ہوتا ہے۔ کسی قوم میں حقیقی قومیت کا تب تک احساس پیدا نہیں ہوتا جب تک اس قوم کی الگ زبان، رسم الخط اور روایات موجود نہ ہوں۔

اس پس منظر میں پنجابی زبان کی بحالی کی ضرورت دوگنا ہو جاتی ہے۔ یہ صرف پڑھے لکھے لوگوں کا مسئلہ ہی نہیں بلکہ عام پنجابی کا بھی فرض ہے کہ وہ مرتی ہوئی زبان کو زندہ رہنے میں اپنے حصے کی ذمہ داری پوری کریں۔

شناخت کا مسئلہ: مادری زبان کے متعلق محسوس کردہ ضرورت:

پنجابی زبان کی تحریک واحد تحریک ہے جو مکمل طور پر شناخت، غیرت کے نام پر، صداقت اور ثقافت کے متعلق غیر محسوس ہے۔ یہ تحریک پنجابی شناخت کو قومی اور پاکستانی شناخت جس میں پنجابی طبقۂ اشرافیہ پر قربان کرنے کے لیے تیار رہی ہے۔ حالانکہ اشرافیہ نے ہمیشہ اس زبان کو انگریزی اور اردو کے مقابلے میں نقصان ہی پہنچایا ہے۔ ایسا کر کے اس طبقے نے عوام پر اپنی حکمرانی کو طول دے رکھا ہے لیکن اس کی قیمت عام آدمی کو یوں ادا کرنا پڑی ہے کہ وہ اپنی زبان پنجابی کے متعلق بات کرتے ہوئے شرمندگی محسوس کرتا ہے۔ پنجابی زبان کے کارکن اس صورت حال کو بدلنا (الٹانا) چاہتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے وہ دوسری پاکستانی زبانیں بولنے والوں کو اس طرح تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں خواہ انہیں زیادہ طاقت اور اختیارات ہی کیوں نہ دینا پڑیں۔ طاقت کی تقسیم کے اس نمونے میں رکاوٹ کے باعث ہی اشرافیہ نے پنجابی زبان کی تحریک کو دیگر پاکستانی زبانوں کی تحریکوں کی نسبت زیادہ نظر انداز کیا ہے۔(22)

پنجابی زبان کے مسئلے پر مسلسل بےحسی کے اثرات:

قیامِ پاکستان کے بعد علاقائی زبانوں کو نظر انداز کرنے والے رویے نے عام آدمی میں عدم تحفظ، محرومی اور ایجی ٹیشن پیدا کیا ہے جس کے نتیجے میں عوام میں مختلف پریشر گروپوں کا قیام عمل میں آیا۔ تاہم، اس کا مثبت پہلو یہ نکلا کہ ''زبانوں کی تحریکوں کے کارکنوں نے محسوس کیا کہ وہ غیر محسوس طریقے

سے شناخت، عزت واحترام، صداقت اور ثقافت کے تحفظ کے لیے کام کر رہے ہیں۔''[23]

یہ وہ مسئلہ ہے جس سے آنے والے دنوں میں حکمران اشرافیہ کو واسطہ پڑنے والا ہے۔ اس کا ایک ممکنہ حل تو یہ ہے کہ زبانوں کے متعلق موجودہ پالیسی کو جاری رہنے دیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی بولنے والا طبقۂ اشرافیہ ہی تمام وسائل کا براہِ راست مالک بنا رہے۔ اس عمل سے مقامی ثقافتوں کو خطرات لاحق رہیں گے، تہذیب وتمدن کمزور ہوگا اور عوام میں یہ راسخ ہو جائے گا کہ انگریزی بولنے والی اشرافیہ ان کا استحصال کر رہی ہے۔ ویسے اب بھی وہ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ ایسی پالیسی ان مرکز پسندوں کو خوب بھاتی ہے جو ناانصافی، عدم مساوات اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کے قائل ہیں۔[24]

اختتام:

درج بالا مباحث اور تجزیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ سرکاری سطح پر پاکستانی زبانوں و ادب کے فروغ کی فوری اور اشد ضرورت ہے۔ ان میں سے کچھ زبانوں کے لیے مارکیٹ محدود ہوگی جس کے لیے انفرادی مصنفوں کو اپنی تصانیف شائع کرنے کے لیے مالی وسائل فراہم کیے جائیں کیوں کہ ان کے پاس نہ وسائل ہیں اور نہ ہی وہ ادھار لے کر نقصان کا رسک لے سکتے ہیں۔[25]

ہم سمجھتے ہیں کہ تین لسانی فارمولہ پاکستان جیسے ملک کے لیے ممکنہ مناسب حل ہے۔ انگریزی سیکھنے اور پڑھنے سے ہم دانشورانہ سطح پر اعلیٰ مقام حاصل کر سکتے ہیں اور دنیا بھر کے علوم سے فیض پا سکتے ہیں۔ اس زبان سے ہم دنیا بھر کے انسانوں سے اپنا رشتہ جوڑ کر ان سے مکالمہ کر سکتے ہیں۔

دوم، ہر پاکستانی کو اردو پڑھنا چاہیے، جو ایک لچکدار اور سیکھنے میں آسان زبان ہے، جس کے ذریعے ہم دیگر پاکستانی زبانوں اور ان کی ثقافت سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ اس زبان کے سیکھنے اور پڑھنے سے ہم کسی کی مادری زبان کو غیر اہم نہیں سمجھتے جس طرح اردو بولنے والے محفوظ ہیں اسی طرح دیگر زبانوں کے بولنے والے تحفظ محسوس کریں گے۔

جدید دنیا کے ماہرین تعلیم کا اس حقیقت پر اتفاق ہے کہ تعلیم کا مؤثر ترین ذریعہ بچے کی مادری اور قومی زبان ہوسکتی ہے، جو اس کے گھر، مسجد، بازار، سکول، ماحول اور معاشرے کی زبان ہو وہی حصول علم کی زبان ہو تو اس کی ذہنی نشو ونما کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ بچہ جس زبان میں خواب دیکھے اگر وہی زبان اس کا ذریعۂ تعلیم ہو، اسی زبان میں وہ سوچ وفکر کرے تو علوم وفنون کی زیادہ وسیع دنیا کے دروازے اس پر وا ہو جاتے ہیں اور وہ زیادہ خود اعتمادی کے ساتھ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنی مادری زبان پنجابی کو سیکھنے اور مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے نتیجے میں ہم اپنی دانشورانہ بنیادوں اور ذہنی چوکسی کو بچپن ہی سے مضبوط کر سکتے ہیں۔ ہمیں دیگر پاکستانی زبانوں کی ثقافت اور ادب کو جاننے کی بھی ضرورت ہے اور انہیں اپنی پنجابی زبان میں سمونے کی بھی ضرورت ہے تا کہ سوجھ بوجھ کے ساتھ ہم ان زبانوں کے ساتھ روابط بڑھا کے پاکستان میں قومی

یک جہتی کے فقدان پر قابو پا سکیں۔ نوجوان نسل کو زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنا چاہییں مگر پاکستانی زبانوں کو ترجیحاً سیکھنا چاہیے تا کہ وہ پاکستان کی ترقی میں بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

حوالہ جات

* ایسوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، فیصل آباد

1- Murray Thomas, R., (Editor), Education's role in National Development Plans, Praeger Publishers (New York: One Madison Avenue, 1992)4-

2- Murray Thomas, R., (Editor), 4-

3- Quddus, Naseem Jaffer, Problems of Education in Pakistan (Karachi: Royal Book Company, 1990)215-

4- Anwer S. Dil (Editor), Language in Social Groups (California: Stanford University Press, Stanford, USA, 1971)22-

5- Anwer S. Dil (Editor), Language in Social Groups, 1-

6- Anwer S. Dil (Editor), Language in Social Groups, 21-

7- Anwer S. Dil (Editor), Language in Social Groups, 22-

8- Anwar S. Dil (Editor), Pakistani Linguistics (Lahore: Linguistics Research Group of Pakistan, 1963)79-

9- Anwar S.Dil (Editor) Language in Socio-cultural Change, (California: Stanford University Press, 1972)135-150-

10- Quddus, Naseem Jaffer, Problems of Education in Pakistan, 220

11- cf. Report of National Commission on Education, 1959

12- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan (Karachi: OUP, 1996) 208-

13- M. Siddiq Kalim, Pakistan: An Educational Spectrum (Lahore: Arsalan Publications, 1978)103-

14- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 209-

15- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 209-

16- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 209-

17- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 191-

18- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan,191-92-

19- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan,192-200-

20- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan,189-209-

21- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan,10-

22- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 252-

23- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 252-3-

24- Tariq Rehman, Language and Politics in Pakistan, 253-

25- Quddus, Naseem Jaffer, Problems of Education in Pakistan,18-

* راحیلہ عنبرین

شیکسپیئر کے ڈرامہ ''رومیو اور جولیٹ'' اور وارث شاہ کی ''ہیر'' کے نسوانی کرداروں کا تقابلی جائزہ

Abstract:

Females grappled for their existence and face many problems and obstacles in every field of life. She is exploited. She faced male dominating society in all over world; even she has not allowed to chose her life partner with her own choice. In''Heer'' Waris shah presented Heer and Sehti as a bold, true and sincere characters in their love with Ranjah and Murad, but other characters are mixed customary and introvert. In Shakespeare's drama Romeo & Juliet heroin of the play also face male dominating society. Although these female characters belongs to different societies but both faced tragic end.

Keywords: *Shakespeare, Romeo & Juliet, Waris Shah, Heer, Female Character, Sehti, Society*

شیکسپیئر کا تعارف:

عظیم ڈرامہ نگار ولیم شیکسپیئر 1564ء میں وارِوک شائر (Warwickshire) کے ایک گاؤں اسٹراٹفورڈ اپان ایون (Avon-Upon-Stratford) میں پیدا ہوئے۔والد جان شیکسپیئر گوشت، پشم، اناج وغیرہ فروخت کیا کرتے تھے۔اس بنا پر یہ بات مشہور ہے کہ شیکسپیئر قصاب کا بیٹا ہے۔ (1) باپ طویل عرصے تک خوشحال زندگی بسر کرتا رہا اور اپنے آس پڑوس میں اُس کی بڑی عزت وحرمت تھی حتیٰ کہ اپنے علاقے کے سماجی کاموں کو سرانجام دیا کرتا تھا۔ایک دفعہ میونسپلٹی کا صدر بھی چنا گیا۔اسی عرصہ میں جان شیکسپیئر کو ناموافق حالات پیش آئے اور مالی مشکلات سے دوچار ہوا۔ چنانچہ 1587ء میں مجبور ہوا کہ اپنی زمین اور جاگیر کا کافی حصہ گروی رکھے۔آخر کار دیوالیہ ہو گیا۔یہ پہلی مصیبت اور تکلیف تھی جس میں ولیم شیکسپیئر ابتدائی عمر میں مبتلا ہوا یعنی اپنے خاندان کی دولت کا زوال دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اس کا باپ کس طرح عزت اور دولت کی بلندی سے ذلت اور مفلسی کے گڑھے میں گرا۔

شیکسپیئر نے ابتدائی تعلیم لاطینی زبان کی ابتدائی مشقوں سمیت اسٹراٹفورڈ کے ہائی سکول میں حاصل کی لیکن تیرہ سال کی عمر میں مجبوراً تعلیم چھوڑ دی تاکہ تنگدستی اور مفلسی کے دنوں میں باپ کی مدد